روبینہ فیصل
دستک
rubyfaisal@hotmail.com

اپنی موت کے ساتھ ایک دن

ذیادہ تر جب کوئی موت نظر سے گذرتی ہے تو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ اس سے ہمیں بھی گذرنا ہے۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہی، گور پیا کوئی ہور۔

مگر کبھی کبھی، انسان کو اپنی موت کے منظر کا سامنا ہو جاتا ہے۔شاید یہ لمحہ ہر کسی پر نہیں آتا اور ہر وقت نہیں آتا۔خواہشوں، خوشیوں، اور دکھوں بھری اس زندگی میں انسان ہر طرح کے لمحات سے گذرتا ہے مگر موت کے لمحات کا زندوں پر ظہور ہو جائے، ایسا کم کم ہی ہوتا ہے۔ نہ جانے ایسے لوگوں سے، جنہیں خدا، ضرورت سے ذیادہ حساسیت اور آگاہی سے نوازتا ہے، خوش ہوتا ہے یا ناراض؟۔کیونکہ ایسے لوگوں کے جسم اور روح کی جنگ زندگی میں ہی جاری رہتی ہے۔جسم، " کی جاناں میں کون آں " کی تلاش میں روح سے اپنی شناخت کا سوال پوچھتا رہتا ہے اور روح ان سوالوں کی چبھن سے بے چین رہتی ہے۔دونوں تمام عمر ایک دوسرے کے ساتھ بندھے مگر ایک دوسرے سے شاکی رہتے ہیں اور ایسا انسان زندگی کی گہرائی میں اتر جاتا ہے اور شائد انہی کے سامنے جیتی جاگتی موت آ کھڑی ہوتی ہے پھر موت بھی ان سے سوال پوچھتی ہے۔

مجھے ڈاکٹر نے کہا ایک اور الٹرا ساؤنڈ ہوگا، اسے شک تھا اسی موزی بیماری کا جو آج کے دور میں ہر گھر سے ایک فرد اٹھا کر لے جاتی ہے یعنی کینسر۔میں نے ڈاکٹر کے ان کہے لفظوں کو اور اس کے ڈر کو اپنے اندر ایک سرد لہر کی صورت محسوس کیا اور بس وہی لمحہ تھا جب زندگی کے ہوتے ہوئے موت سامنے کھڑی بالکل قریب محسوس ہوئی، اتنی قریب کے لگا وہ ہاتھ بڑھا کر کبھی بھی مجھے چھو سکتی ہے، کچھ دنوں میں، کچھ ہفتوں میں، کچھ مہینوں میں یا چند سالوں میں۔۔زندگی بھر انسان زندگی کو گذارتا ہے مگر موت ایک پل کو آتی ہے اور بس اپنا بنا کر چلی جاتی ہے۔مجھے موت تو نہیں موت کا احساس اتنا شناسا لگا، کہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ یہ زندگی کا متضاد ہے۔بلاشبہ زندگی کا سب سے بڑا سچا دوست موت ہی ہے۔

دوسروں کی موت کے ساتھ انسان جینا سیکھ لیتا ہے مگر اپنی موت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ تصور ان سب موتوں سے جوڑ دیتا ہے، جو ہم زندگی میں اپنوں کی، پیاروں کی دیکھ چکے ہوتے ہیں۔اپنی موت کو میں نے ان سب موتوں سے جوڑ کے دیکھا تو جواب ملا کسی کے جانے سے جو خلا رہ جاتا ہے وہ کتنا خالی خالی سا اور غیر اہم ہوتا ہے۔

کفن میں لپٹ کر قبر کے اندر اتر کر جب اپنی ذات دیکھی تو ارد گرد پھیلی کچھ آہیں، کچھ سسکیاں سنائی دیں۔اپنے بچوں کے چہرے پر پھیلی وحشت دیکھی تو قبر کا اندھیرا بڑھ گیا۔وہ سکتے کے عالم میں کھڑے تھے، اتنے چھوٹے کے ابھی ٹھیک سے غم منانا بھی نہیں سیکھ پائے تھے۔

خاندان کی خواتین انہیں سینے سے چمٹائے احساس دلا رہی تھیں کہ تمھاری ماں مرگئی ہے اور اب تم لوگ کبھی اسے اس دنیا میں نہیں دیکھ پا ؤ گے۔ یہ سنتے ہی بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ رشتہ دار خواتین کے چہروں پر مشن کی کامیابی کی ہلکی سی چمک ابھر آئی۔ میری بیٹی نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، اب کون ہوگا جس کے سینے پر سر رکھ کر وہ سب غم بھول جایا کرے گی۔ کوئی نہیں؟ کون اس کے بالوں کو سہلائے گا؟ کوئی نہیں؟ ماں کا دیا اعتماد ساری دنیا مل کے چھین لے گی تو وہ کیا کرے گی؟ گھر سے ماما جب کبھی چلی جاتی تھیں تو بھائیوں اور پاپا کے ساتھ وہ کتنی مشکل سے وقت گذارتی تھی۔۔ اب کیا ہوگا؟ سایہ ہٹنے کا احساس کرتے ہی، بیٹی کے چہرے پر غم کی چھاپ میرے کفن میں ہلچل مچانے لگی۔ سب سے چھوٹے بچے نے بڑے بچوں کے سینے میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر وہ اپنے اپنے غم میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے، کہ اس کو ساتھ تو لگا لیتے مگر سنبھال نہ پاتے۔

ہر شوہر کی طرح، میرے شوہر کو بھی غم ہوگا، مگر کفنانے دفنانے کے مراحل کی فکر حاوی ہوگئی ہے۔ اسے لوگوں کو اکھٹا کرنا، ہجوم بنانا نہیں آتا۔ ایسے کام تو میں ہی کرتی تھی۔ اب یہ کیا کرے گا؟ کیسے اطلاع دے گا کسی کو، کیسے سب کام اکیلے کرے گا۔ سب خراب کردے گا۔ میرے جنازے کو بھی برات کی طرح بے رونق کرے گا۔۔ اسے ایسے کام آتے ہی نہیں، اسے کسی کو مدد کے لئے بھی نہیں کہنا آتا۔ بے چینی آخری لباس میں اتر آئی، کفن کا سفید رنگ پیلا پڑنے لگا۔ میں شریکِ حیات کے اس کام کو کیسے بانٹوں؟

موت ابھی چارپائی پر ہی دھری تھی اور بھائیوں، بہنوں اور دوستوں نے ایک دوسرے کو فون کئے، کچھ نے فیس بک کے سٹیٹس کو موت کی اس خبر کے ساتھ اپ ڈیٹ کردیا۔ ساتھ ساتھ نوٹ کیا جانے لگا کہ کتنے likes ہوئے، کتنے تعزیتی پیغامات آئے۔

پرانے بنک کے ساتھیوں کو جب خبر ملی تو حیران رہ گئے۔ ہیں؟ وہ کیسے مرسکتی ہے؟ وہ تو زندگی تھی۔ سب کی مدد کرتی تھی، ہم نے کبھی اسے دکھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے کبھی غصہ بھی نہیں آتا تھا۔ بڑی سے بڑی بات بھی پی جاتی تھی۔ ہاں مگر بے ایمانی اور جھوٹ برداشت نہیں کرتی تھی ۔مینجر سے بھی ٹکر لے لیتی تھی، بڑی بہادر تھی۔

ہیلی کالج کی دوستوں کو پتہ چلا تو وہ بھی ششدر رہ گئیں، کہنے لگیں اتنا ہنستی تھی اتنا ہنستی تھی کہ اسکے گلی کا موڑ مڑنے کی دیر ہوتی تھی کہ گھر بیٹھے اس کی ہنسنے کی آواز آجاتی تھی ۔راہ چلتوں پر فقرے کستی تھی سب کو چھیڑتی تھی، اتنا چھیڑنے والی، اتنا ہنسنے والی، زندگی کو اتنا غیر سنجیدہ لینے والی کیسے مرگئی؟ نہیں!! یقین نہیں آتا۔ فیس بکس کے کمنٹس میں اضافہ ہونے لگا۔

ایف سی کالج کے کلاس فیلوز کو پتہ چلا تو وہ بھی بے یقینی سے گنگ ہوگئے۔ ہنسنے مسکرانے والی، چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنے والی، جس نے پو ری کلاس کے نام ڈال رکھے تھے۔ جو کلاس کی زندگی تھی۔۔ موت اسے کیسے آگئی۔ ایک دوسرے کو فون بجنے لگے۔

کالم پڑھنے والوں کو پتہ چلا تو کہنے لگے، ہم نے دردمندی، سچ اور غیر جانبداری انہی کالموں سے سیکھی۔ انسانی حقوق کی آواز انہی کالموں سے اٹھتی تھی، بغیر غرض کے پاکستان سے محبت میں لکھے گئے کالم، کینڈا میں بیٹھ کر عام پاکستانیوں کی آگاہی کے لئے ایسا بے لوث کام کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کمنٹس میں مجھ کم بخت کے ہاتھوں لکھے گئے افسانوں پر بھی بات ہونے لگی۔ بہادری اور ہمت کی داستانیں رقم ہونے لگیں۔ کمنٹس کا

صفحہ بھر گیا۔ کسی رائٹر دوست نے ایک مضمون بھی لکھ دیا۔ اس مضمون میں کی گئی تعریفیں اور میرے وجود کے بعد پیدا ہونے والے خلا کا ذکر اس قدر دردمندی سے تھا کہ میرے کفن کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔۔

میرے ماں باپ کا دکھ بانٹنے کی ناکام کوشش ہونے لگی، اپنے بچوں کی خاطر دی جانے والی قربانیوں کا ذکر، پورے خاندان میں ہونے لگا۔ اپنے چھوڑ، دوسروں کے بچوں کو ماں کا پیار دینے کی کہانیاں دہرائی جانے لگیں۔۔ جو میرے خلوص کو استعمال کر کے کوڑا کچرا کر کے آگے بڑھ گئے تھے، انہوں نے بھی مڑ کر دیکھا اور اپنا سینہ پیٹا کہ کاش ہم اس کے پیار کی قدر کر لیتے، خلوص کی قیمت چند الفاظ محبت کے ہوتے ہیں، وہی ادا کر دیتے۔ نظریات سے اختلاف رکھنے اور اس بنا پر میری کردار کشی کرنے اور مجھ پر اسٹبلشمنٹ کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگانے والوں کے کمنٹس بھی میری سچائی کی داستان لکھنے لگے۔

کاش!! مجھے زندگی میں ان میں سے سچی تعریف کا ایک بھی لفظ بھی سننے کو مل جاتا تو شائد میں کچھ دن اور جی لیتی، اور خوب جی بھر کے جی لیتی ۔۔۔۔۔۔ جس تعریف کی بھوک سے میرا جسم ہڈی بن گیا، اب اس کی فروانی سے کفن کا پیٹ پھول گیا تھا۔

اور پھر تین دن بعد سب کمنٹس دھندلانے لگے۔ میری موت کا غم بھلانے والوں نے زیادہ شدت سے جینا شروع کر دیا۔ اور قبر پر پڑے پھول میرے بعد زندگی میں پیدا ہونے والے خلا کی طرح سوکھنے لگے۔